شاہد احمد دہلوی

"...... میں اتنی ادبی اور موسیقی کی انجمنوں کا صدر، سکریٹری یا مجلسِ عاملہ کا ممبر رہا ہوں کہ اب ان کی تعداد بھی یاد نہیں۔ گوشہ گیری کے باوجود مجھے اب بھی بخشا نہیں جاتا۔ رانڈیں تو بہتیری بیٹھیں مگر رنڈوے بیٹھنے بھی دیں۔ شاہد احمد دہلوی کو تو نشان کا ہاتھی سمجھا جاتا ہے، یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے............"

ضلع بجنور (یو۔پی) کے ایک گمنام سے قصبہ ریہڑ میں غریب مولویوں کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو شفیق باپ نے پرانے دستور کے مطابق اسے قرآن شریف پڑھایا اور عربی فارسی کی چند ابتدائی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھائیں۔ مولویوں کا یہ گھرانا اتنا غریب تھا کہ اس کے اس بچے کا بار بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ بچہ بے حد ذہین اور پڑھنے کا شوقین تھا۔ باپ نے سوچا کہ دلی چل کر بچے کو کسی درسگاہ میں داخل کر دیا جائے۔ اس زمانے میں دلی کی مسجدوں میں پڑھانے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اپنے بچے کو لے کر دلی پہونچے اور کسی شناسا کی مدد سے بچے کو پنجابی کٹرے کی مسجد میں بٹھا دیا۔

یہ واقعہ ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے کا ہے۔ بچے کی عمر اس وقت ہوگی کوئی آٹھ دس سال کی۔ باپ اسے مسجد کے مُلّا کے حوالے کر کے اپنے گھر چلے گئے۔ مسجد ہی میں طالب علم رہتے تھے۔ رہتے کیا خاک تھے، رات کو کسی کونے کھدرے میں یا صحن میں پڑ رہتے۔ مسجد کا مُلّا بڑا بے رحم تھا۔ قمچی سے لڑکوں کی کھال ادھیڑنے میں اُسے بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ دیہاتی لڑکا کڑکڑاتے جاڑوں میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ٹاٹ کی صفوں میں لپٹ کر رات گزار رہتا۔ بچہ ہی تھا، کبھی صبح کو آنکھ نہ کھلتی تو مُلّا ایک لات رسید کرتا تو لڑکا لڑھکتا چلا جاتا اور صف بھی بچھ جاتی۔ طالب علموں کے کھانے کا یہ انتظام تھا کہ محلے کے گھروں سے ان کی روٹی بندھی ہوئی تھی طالب علم جاتے اور گھروں سے روٹیاں مانگ لاتے اور جیسی بھی روکھی سوکھی ملتیں اللہ عزیز کر لیتے۔ دیہاتی لڑکے کو جس گھر سے روٹی ملتی تھی وہ ایک جید عالم مولوی عبدالقادر کا گھر تھا۔ مفت کی روٹیاں بھلا مروڑنے کون دیتا ہے؟ مولوی صاحب کی بیوی اس طالب علم سے بازار کا سودا منگواتیں، کوڑی پھرا کراتیں، گھر کا پانی بھرواتیں اور مسالہ پسواتیں۔ ان کی ایک لڑکی پانچ چھ سال کی تھی اسے بہلانا اور کولھے پر چڑھائے چڑھائے پھرنا بھی طالب علم کے ذمے تھا۔ لڑکی بڑی نٹ کھٹ اور چُلبلی تھی۔ اگر مسالہ ذرا موٹا رہ جاتا تو اسی بٹے سے لڑکے کا ہاتھ کچل دیتی۔ غریب "سی" کر کے رہ جاتا۔ مگر تعلیم کے شوق میں مُلّا کی لاتیں بھی کھاتا اور لڑکی کی مار بھی سہتا۔ راتوں کو مسجد کے ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں پڑھتا۔ جب یہ میسر نہ آتی تو گلی کی لالٹین کے نیچے کتاب لیکر بیٹھ جاتا اور اپنی آنکھوں کا تیل نکالتا رہتا۔ دو ایک سال یوں گذرے۔ پھر اتفاق سے دلی کالج کی طرف گذر ہوا تو دیکھا کہ داخلہ ہو رہا ہے۔ ایک صاحب بہادر بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ کالج کے استاد بھی بیٹھے ہیں۔ لڑکوں کا باری باری زبانی امتحان لے رہے ہیں اور پاس فیل کر رہے ہیں۔ یہ کم عمر طالب علم بھی ہجوم میں گھس کر آگے بڑھنے لگا کہ کسی نے دھکا جو دیا تو گر پڑا اور رونے لگا۔ صاحب نے جو اسے روتے دیکھا تو چمکار کر اپنے پاس بُلا لیا۔ پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟" لڑکے نے کہا "میں بھی کالج میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔" صاحب نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور بولے "تم ابھی چھوٹے ہو۔ یہاں کی کتابیں نہیں پڑھ سکو گے۔" لڑکے نے کہا "میرا بھی امتحان لے لیا جائے۔" صاحب نے ایک کتاب میز پر سے اٹھا کر دے دی۔ کہا "اسے کہیں سے پڑھو۔" لڑکے نے کتاب کھول کر فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔ سب حیران ہوئے۔ صاحب نے پاس بیٹھے ہوئے مولانا کی طرف دیکھا۔ مولانا نے ایک اور کتاب آگے بڑھا دی۔ لڑکے نے اس میں سے بھی بے جھجک پڑھنا شروع کر دیا۔ سب بہت خوش ہوئے

اور لڑکا دلی کالج میں داخل ہوگیا۔ شوق اور ذہانت سے یہ لنگر لڑکا اڑا اور کالج کی ساری منزلیں طے کرگیا۔ پھر مدرس بنا، انسپکٹر بنا اور ترقی کرکے ڈپٹی کلکٹر بن گیا۔ اسی اثنا میں مولوی عبدالقادر صاحب نے دیکھ لیا کہ لڑکا ہونہار ہے، اپنی لڑکی سے اس کی شادی کردی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اس لڑکے کا کولہا توڑا کرتی اور مرچوں بھرے بٹے سے اس کا ہاتھ کچل دیا کرتی تھی۔

ملازمت ہی کے زمانے میں ان صاحب نے کتابیں لکھیں جو اپنی مقبولیت کے سبب ان کی شہرت و عزت کا باعث ہوئیں اور سالار جنگ اس زمانے میں حیدر آباد دکن میں اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کو شمالی ہند سے بلا بلا کر بڑے بڑے عہدوں پر مامور کر رہے تھے۔ ان صاحب کو بھی دگنی تگنی تنخواہ پر انہوں نے بلالیا اور اس ریاست میں بھی انہوں نے اپنی عمدہ کارگزاری سے بلند ترین مرتبہ حاصل کیا۔ چند سال بعد جب دکن سے وظیفہ لے کر دلّی آئے تو لکھ پتی تھے اور علم و فضل کے آسمان پر سورج بن کر چمک رہے تھے۔

آپ سمجھے بھی یہ کون بزرگ تھے؟ یہ تھے خان بہادر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل۔ جن کی کتابیں "مراۃ العروس" "توبتہ النصوح" وغیرہ اور جن کا ترجمۂ قرآن رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں لڑکیاں تو کئی ہوئیں مگر لڑکا صرف ایک ہی ہوا، جس کا نام انہوں نے بشیرالدین احمد رکھا۔ میاں بشیر انگریزی محاورہ کے مطابق، چاندی کا چمچہ منہ میں لیے پیدا ہوئے۔ دونوں ماں باپ ان پر پروانہ وار نثار تھے۔ ابتدا میں ڈپٹی صاحب بھی نے انہیں عربی اور فارسی پڑھائی۔ اُردو میں بچوں کے لئے مناسب کتابیں نہیں تھیں اس لیے شفیق باپ نے بیٹیوں کے لیے مراۃ العروس لکھی اور بیٹے کے لیے منتخب الحکایات۔ حسن اتفاق سے محکمہ تعلیمات کا ایک بڑا انگریز افسر دورہ کرتا ڈپٹی صاحب کی طرف آنکلا۔ اس نے میاں بشیر سے پوچھا "کیوں میاں کیا پڑھتے ہو؟" میاں بشیر لپک کر اپنی کتاب اُٹھا لائے۔ صاحب نے کتاب کو کہیں کہیں سے پڑھا۔ میاں بشیر نے کہا "آپا کی کتاب بھی لاؤں؟" صاحب نے کہا "ہاں لاؤ" میاں بشیر نے مراۃ العروس کا مسودہ بھی لاکر صاحب کو دے دیا۔ آپ بھی صاحب نے جستہ جستہ دیکھا۔ اتنے میں ڈپٹی صاحب بھی آگئے۔ صاحب نے کہا "مولوی صاحب آپ نے ایسی عمدہ کتابیں لکھی ہیں، انہیں چھپوا دیجئے تاکہ دوسروں کو ان سے فائدہ پہنچے۔" بعد میں یہ کتابیں چھپیں اور حکومت نے ان پر انعام دیئے۔ اور یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں اب تک چھپ چکی ہیں۔

جب میاں بشیر نے میٹرک پاس کیا تو ڈپٹی صاحب دکن سے پنشن پا چکے تھے۔ میاں بشیر نے آگے پڑھا یا اور حیدر آباد جاکر ملازم ہوگئے۔ لڑکپن ہی میں ان کی شادی دلّی کے ایک رئیس خاندان میں ہوگئی۔ دس بارہ سال گزر گئے مگر ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ خاندان کی عورتوں میں چرمگوئیاں ہونے لگی۔ شدہ شدہ بات ڈپٹی صاحب تک بھی پہونچی۔ وہ خود میاں بشیر کی بے اولادی سے افسردہ تھے۔ بہو کے علاج بھی ہوئے مگر معلوم ہوا کہ ان بہو سے اولاد نہیں ہوگی۔ ہار کے میاں بشیر سے دوسری شادی کے لئے کہا گیا۔ میاں بشیر نکاح ثانی کے لئے راضی نہ ہوتے تھے۔ انہیں اپنی بیوی سے محبت تھی۔ بھلا اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے سوکن کو کیوں لا بٹھلاتے؟ کچھ عرصہ اور گزر گیا تو ڈپٹی صاحب نے خود بیٹے کو سمجھایا اور شرعی مسائل سے بھی قائل کیا۔ تنگ آمد بجنگ آمد، باپ کا کہنا ٹال نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا بادل نخواستہ سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ دلّی کے غریب سیّدوں کے ایک خاندان کی دبلی دبائی لڑکی مل گئی۔ جٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگیا۔ میاں بشیر ان چھوٹی بیگم کو اپنے والدین کے پاس دلّی میں چھوڑ کر دکن اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ وہاں اُن کے ساتھ بڑی بیگم رہتی تھیں۔ چھوٹی بیگم

سسرال میں چھوٹی دلہن کہلائیں۔ انہوں نے ساس اور خسر کی اوّل دن ہی سے ایسی خدمت کی کہ دونوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ میاں بشیر جوگی کا سا پھیرا دلّی کا لگا جاتے۔ دس سال بیت گئے۔ چھوٹی دلہن کی کوکھ بھی ہری نہ ہوئی۔ اب تو بڑی دلہن کی بن آئی۔ طعنوں تشنوں سے انہوں نے سسرال والوں کے دلوں میں ناسور ڈال دیئے۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ چھوٹی دلہن کا پیر بھاری ہوگیا۔ اب تو سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور چھوٹی دلہن کی بڑی اللہ آمین ہونے لگی۔ بڑی دلہن کو ٹیلوں پر لوٹ گئیں اور کوئی بہتان ایسا نہ تھا جو انہوں نے چھوٹی دلہن پر نہ تراشا ہو، مگر غریب سیدانی نے صبر کیا اور منہ سے اُف تک نہ کی۔ نویں مہینے اللہ نے چاند سا بیٹا دیا۔ اندھیرے سے گھر میں اس چراغ سے روشنی پھیلی اور بڑی دھوم سے اس کی خوشی منائی گئی۔ بھلا ڈپٹی صاحب کے ہوتے کسی اور کی کیا چلتی؟ میاں بشیر کی بے رخی بھی ختم ہوئی اور چھوٹی بیگم سے بھی التفات کرنے لگے۔ ڈپٹی صاحب نے بچے کا نام مُنذر احمد رکھا۔ چھوٹی دلہن دلّی ہی میں سسرال میں رہیں۔ بڑی دلہن کا زور ابھی نہیں ٹوٹا تھا۔ وہ میاں کے ساتھ حیدر آباد میں رہتی رہیں۔ بچہ یہاں دادا دادی کی آنکھ کا تارا اور سارے خاندان کا دلارا بنا رہا۔

ماں کی ممتا تو ہوتی ہی ہے، باپ کی بھی ممتا ہوتی ہے۔ میاں بشیر اب کے جو دلّی آئے تو گلگوتھنا سا بچہ دیکھ کر ان کی ممتا نے جوش مارا۔ جب دکن واپس جانے کو ہوئے تو اماں کے ذریعہ ابا سے اجازت چاہی کہ چھوٹی دلہن کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ انہیں کیا عذر ہوتا، بخوشی اجازت دے دی۔ چھوٹی دلہن جب حیدر آباد پہنچیں تو بڑی دلہن کو ان کے ساتھ رہنا گوارا نہ ہوا۔ وہ اپنے میکے سدھاریں۔ سوا سال ڈیڑھ سال بعد چھوٹی دلہن کے ہاں دکن ہی میں ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ ڈپٹی صاحب نے نام مبشر احمد رکھا۔ جب تیسرے بچے کے آثار ظاہر ہوئے تو چھوٹی دلہن دلّی آگئیں اور بڑی دلہن حیدر آباد چلی گئیں۔ تیسرا بچہ جب (۲۲ مئی ۱۹۰۴ء) پیدا ہوا تو ڈپٹی صاحب نے نام شاہد احمد تجویز کیا۔ وہ شاہد احمد یہی خاکسار ہے جو آپ کو آج آپ بیتی سنا رہا ہے۔

تین سال تک کی مجھے کوئی بات یاد نہیں ہے۔ ہاں چار سال کے بعد کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ مجھے یہ یاد ہے کہ چار سال کی عمر میں میری آنکھیں اتنی بری طرح دُکھنے آئیں کہ میں اُجالے میں آنکھیں کھول ہی نہیں سکتا تھا۔ اور ان میں جب دوا لگائی جاتی تو ایسی مرچیں لگتی تھیں کہ میں چیخیں مارنے لگتا تھا۔ یہ واقعہ بھی انہی دنوں کا ہے کہ ہم اوپر چھت پر کھیل رہے تھے۔ نیچے گراموفون بجنا شروع ہوا۔ سب بچے گدا گد گدا گد نیچے بھاگے۔ ایک سات آٹھ سال کی بچی جو مجھ پر نوکر تھی مجھے گود میں اٹھا کر نیچے لے چلی۔ جب وہ زینے اترنے لگی تو میں "جلدی چل جلدی چل" کہہ کر اس کی گود میں اچھلنے لگا۔ جلدی میں اس کا پاؤں جو پھسلا تو دونوں کوئی بیس سیڑھیوں پر سے لڑھکتے ہوئے صحن میں آپڑے۔ میری اماں "ہے ہے میرا بچہ" کہہ کر ننگے پاؤں سر بھاگیں۔ انہوں نے مجھے گود میں اٹھایا تو میرے سر سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ ابا مجھے فوراً لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ سر کے پچھلے حصے میں زخم تھا۔ ڈاکٹر نے سات ٹانکے لگائے۔ ڈیڑھ انچ لمبا زخم کا نشان اب بھی باقی ہے۔

اماں کا غمناک چہرہ آج بھی میری آنکھوں میں پھرتا ہے۔ اماں بڑی سنجیدہ خاتون تھیں۔ مجھے ان کا ہنسنا یاد نہیں ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ وہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ قرآن شریف خوش الحانی سے پڑھا کرتی تھیں۔ غرارہ پہنا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں غرارے سوا سولہ کلیوں کے ہوتے تھے۔ فرش پر چلنے میں پیچھے گھسٹتے تھے۔ یہ تو میں نے نہیں دیکھا کہ فرشی پاجاموں کو پیچھے سے لونڈیاں اٹھائے چلتی ہوں۔ اماں تو آگے سے پائنچے اٹھا کر بائیں ہاتھ پر ڈال لیا کرتی تھیں۔ گھر میں مامائیں ملازم تھیں مگر اماں سالن خود بگھارتی تھیں۔ سالن دو قسم کا پکتا تھا، ایک بھنا ہوا

اور ایک شوربہ دار۔ ایک دال بھی ضرور ہوتی تھی۔ گھر ہمیشہ صاف ستھرا چندن سا رہتا تھا۔ بڑے دالان میں چاندنی کا فرش رہتا تھا اور چھوٹے
دالان میں چوکیاں بچھی رہتی تھیں۔ چوکیوں پر دری چاندنی کا فرش ہوتا تھا۔ دونوں دالانوں کی کڑیوں میں ہاتھ سے کھینچنے کے پنکھے لٹکے رہتے تھے جنہیں
کھینچنے کے لئے چماریاں آتی تھیں۔ لُو کے زمانے میں خس کی ٹٹیاں بڑے دالان پر لگ جاتی تھیں اور ایک چھوکرا انہیں تر کرتا رہتا تھا۔ جاڑوں میں پنکھے
اور ٹٹیاں اتر جاتیں اور روئی کے موٹے موٹے پردے باندھ دیئے جاتے۔ رات کو یہ پردے چھوڑ دیئے جاتے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اماں مجھے اپنی گود میں ہر وقت لئے رہیں۔ مگر چمکار کر گود سے اُتار دیا کرتی تھیں۔ جب میری بیٹھو پرکی بہن بشریٰ پیدا ہوئی
تو اس کا لاڈ پیار زیادہ ہونے لگا۔ میں اس سے جلنے لگا تھا اور اماں سے کہا کرتا تھا: "یہ چھی کی، یہ گندی۔" اماں میرا دل رکھنے کے لیئے مجھے خوب
پیار کرتیں۔ ابا سے مجھے ڈر لگتا تھا، وہ غصیل آدمی تھے، ان کی آواز گرج دار تھی، ان کی ڈانٹ سے نوکروں کا دم نکلتا تھا۔ ترکی پٹے اور تاب
تھراتے، ہم سبھی اُن سے ڈرتے تھے۔ ویسے وہ سب بچوں سے بڑی محبت کرتے تھے، گود میں بھی لیا کرتے تھے، ساتھ سلاتے بھی
تھے، پیار بھی کرتے تھے مگر ان کا خوف دل سے دور نہ ہوا۔ جوان ہونے اور باپ بن جانے کے بعد بھی ان سے ڈر لگتا تھا اور بے بلائے
کبھی اُن کے سامنے نہیں جاتے تھے۔ جب وہ گھر میں آتے تو ہم اِدھر اُدھر دبکتے پھرتے۔

دادا ابا صرف اتنے یاد ہیں کہ جب ابا ہمیں لے کر دلّی آیا کرتے تھے تو کوچہ نواب مرزا والے مردانہ مکان میں ہمیں اپنے
ساتھ لے جاتے تھے۔ پیش دالان میں دو منشی بیٹھتے تھے۔ پس دالان میں دروازے اور رنگ برنگ شیشوں والے بستے لگا کر کمرہ بنا دیا گیا
تھا۔ اس میں دائیں طرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک چھدری ڈاڑھی والے بڑے میاں بیٹھے رہتے تھے۔ ابا اس کمرے میں داخل ہوتے
ہی ان بڑے میاں سے لپٹ جاتے اور رونے لگتے۔ ہم حیران کھڑے سوچتے رہتے کہ ابا رو کیوں رہے ہیں اور یہ بڑے میاں کون ہیں۔
پھر ابا ان سے الگ ہو کر ہم سے کہتے، "دادا ابا کو سلام کرو۔" ہم سلام کرتے تو وہ باری باری سے سب کو پیار کرتے اور صندوقچہ
میں سے نکال کر ایک ایک اشرفی ہمیں دیتے۔ دادا ابا کے ملازم خدا بخش نے صحنچی میں بہت سارے کبوتر پال رکھے تھے۔ ہم کمرے میں سے باہر نکل
کر کبوتر دیکھنے لگتے اور ابا بہت دیر تک دادا ابا سے باتیں کرتے رہتے۔

دادی اماں ہمیں بالکل یاد نہیں ہیں۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ دادا ابا کی دیکھ بھال کے لیئے ہماری اماں دلّی ہی میں رہنے
لگی تھیں۔ زنانی ڈیوڑھی اور مردانہ گھر دونوں دادا ابا ہی کے بنوائے ہوئے تھے۔ ان دونوں گھروں کے درمیان ایک مکان چچا اشرف
حسین کا آ گیا تھا۔ اشرف حسین صاحب میرے والد کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اماں صبح کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا دادا ابا کے
لیئے خود لیکر گلی میں سے جایا کرتی تھیں۔ بشریٰ کے بعد ہمارا ایک اور بھائی پیدا ہوا جس کا نام دادا ابا نے منیراحمد رکھا تھا۔ اچھا خاصا کھیلتا
مالتا بچہ دو گھڑی میں چٹ پٹ ہو گیا، اسے مُونس کھا گئی۔ رشتہ کنبہ کی عورتیں دیدے مٹکا مٹکا کے اور ہاتھ نچا نچا کر کہتیں: "اے اب
تو چھوٹی دلہن چار چار بچوں کی ماں بن گئیں۔ لو بیوی ان کا مان نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا۔" ایسی ٹوک لگی کہ وہ بچہ ہی اپنی جان سے
جاتا رہا۔ صبح ہوتے اس بچے کا انتقال ہوا۔ میری اماں بڑی صابر سیدانی تھیں۔ انہوں نے اپنے روزانہ کے معمول میں فرق نہیں آنے
دیا۔ صبح وقت مقررہ پر دادا ابا کا ناشتہ لے کر گئیں۔ انہیں ناشتہ کرانے کے بعد ان سے ضبط نہ ہوسکا اور رونے لگیں۔ دادا ابا نے
گھبرا کر پوچھا: "کیوں چھوٹی دلہن خیر تو ہے؟" اماں نے کہا: "منیر اللہ کو پیارا ہو گیا۔" دادا ابا اس واقعہ کا ذکر ہر آئے گئے سے کیا کرتے

تھے کہ "چھوٹی دلہن کے صبر و ضبط کو شاباش ہے۔ بچہ ملا پڑا ہے اور ناشتہ تیار کر کے خود لا رہی ہیں اور مجھے کھلا رہی ہیں۔ پہلے نہیں بتایا کہ میں کہیں ناشتہ نہ چھوڑ دوں۔"

میرے بعد ایک لڑکا دلّی ہی میں اور ہوا جس کا نام سراج الدین احمد دادا آبا ہی نے رکھا۔ یہ گود میں تھا کہ اماں حیدرآباد چلی گئیں۔ ۱۹۱۲ء میں دادا آبا کی بائیں طرف فالج گرا اور وہ دو تین ہی دن میں چل بسے۔ یہاں انہی دنوں میں میری سب سے چھوٹی بہن صفیہ پیدا ہوئی۔ اماں ابھی حاملہ تھیں۔ دادا آبا کے انتقال کی وجہ سے دلّی روانہ ہو گئے۔ خبر نہیں جاپے میں کیا بگاڑ ہوا کہ اماں ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر ایکا ایکی سدھار گئیں۔ ابا کو تار دیا گیا، شاید ریل ہی میں اُن کو مل گیا۔ اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے، آئے تو جنازہ صحن میں رکھا ہوا تھا۔ کہرام مچ گیا۔ ابا ایک ایک بچے کو گلے لگاتے اور روتے رہے۔ شام تک اماں کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ اماں کی پروردہ ایک چھوکری تھی برقی۔ اماں نے اسے ملازمہ نہ بنا کر بیٹی بنا کر پالا تھا۔ اس کی شادی بھی ابا کی بیٹھک کے ایک چپراسی مخدوم صاحب سے کر دی تھی۔ ہم سب بچے انہی دونوں سے ہلے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے اس موقع پر کچھ ایسی جان توڑ کر خدمت کی کہ ہم اماں کے غم کو بھول گئے۔ صفیہ صرف بارہ دن کی تھی، اس کے لیئے فوراً ایک انا تلاش کی گئی۔ انا کا دودھ اسے راس آگیا اور اس نے پالا بھی اسے اپنی بچی کی طرح۔ ابا کو گھر کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوشش کر کے حیدرآباد سے اپنا تبادلہ کرا لیا۔ ضلع رائچور کے اوّل تعلقدار مقرر ہو گئے۔

رائچور پہنچنے کے بعد ہمیں کانونٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ابا ہمیں خود بھی پڑھاتے تھے اور ایک ماسٹر بھی ہمیں پڑھانے آتا تھا ایک یوروپین گورنس ہم پر رکھی گئی۔ یہ ہم سے انگریزی میں بات کرتی تھی اور ہمارے کھانے، لباس، کھیل، تیز برتاؤ کا خیال رکھتی تھی۔ کانونٹ اسکول میں صرف ہم ہی ہندوستانی بچے تھے، باقی سب لڑکے لڑکیاں یوروپین تھیں۔ ایک سال کی اثنا ہی میں ہم انگریزی روانی سے بولنے لگے تھے۔

۱۹۱۶ء میں ہم ابا کے ساتھ دلّی آئے تو مطبع مجتبائی میں ابا کی ملاقات ڈاکٹر ضیاالدین سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڈھ میں داخل کر دیجئے۔ چنانچہ ہم تین بھائیوں کو ایم اے او اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ظہور وارڈ کا پانچ نمبر کا کمرہ ہمیں دیدیا گیا۔ بڑے بھائی ساتویں میں داخل ہوئے اور منجھلے بھائی اور میں پانچویں میں۔ بشریٰ عبداللہ صاحب کے زنانہ اسکول میں داخل کر دی گئیں۔ ہماری خدمت کرنے کے لئے مخدوم صاحب کو بھی ساتھ کر دیا گیا۔ مجھے اور منجھلے بھائی کو یہ یکسر تبدیلی بے حد ناگوار گذری۔ سوائے انگریزی کے ہم باقی سارے مضمونوں میں پھسڈی تھے۔ لہٰذا کالج کے ایک طالب علم کو ہمیں پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ یہ سرحد کے ایک صاحب عبدالحق تھے جو بعد میں ریلوے میں اے ٹی ایس ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ بہت محنت کی اور ہمیں اس لائق کر دیا کہ کلاس میں چل جائیں۔

ہمارے ساتھ بورڈنگ میں بھی اور کلاس میں بھی امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ ماسٹر ناظر حسن اور ماسٹر عزیزالحسن لڑکوں کو بے دردی سے مارتے تھے مگر ہم پر ان کی نظر کرم ہی رہی۔ مولانا اسلم جیراجپوری ہمیں فارسی پڑھاتے تھے اور ہمیں غیرت دلاتے رہتے تھے کہ " دیکھو تم کس دادا کے پوتے اور کس باپ کے بیٹے ہو۔ اگر تم نہیں پڑھو گے تو لوگ کیا کہیں گے "۔ ناچار پڑھنا پڑتا تھا۔

بورڈنگ میں ہر قسم کا آرام اور بہت باقاعدگی تھی۔ پانچوں وقت کی نماز وقت سے پڑھنی ہوتی تھی۔ روزانہ شام کو ہاکی فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا ہوتا تھا۔ مگر علی گڈھ میں جب تک رہے طبیعت اچاٹ ہی رہی۔ دو سوا دو سال یہاں پڑھنے پائے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک شروع ہو گئی اور مولانا محمد علی نے علی گڈھ ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کر دیا۔ اسی زمانے میں ابا نے ہمیں علی گڈھ

سے اٹھالیا اور دلّی کے عربک اسکول میں داخل کردیا۔ ابّا پنشن لے کر دلّی آگئے تھے اور دادا ابّا کی اور اپنی کتابیں چھپوا رہے تھے۔ اسی زمانے میں ابّا نے دلّی کے چیف کمشنر ہیلی کی فرمائش پر تاریخ دہلی لکھنی شروع کی تھی۔ کئی کئی گھنٹے روزانہ لکھتے تھے اور دلّی کے سارے کھنڈروں میں گھومتے پھرتے تھے۔ تین ضخیم جلدوں میں یہ تاریخ مکمل ہوئی تو ہیلی صاحب نے اس پر سرکار سے انعام دلوایا۔ خان بہادر کا خطاب بھی دینا چاہتے تھے مگر ابّا نے اسے منظور نہیں کیا، کیونکہ خطاب یافتہ کو گورنمنٹ کا پٹھو سمجھا جاتا تھا۔ مولوی عبدالاحد خاں نے خان بہادر کا خطاب واپس نہیں کیا تھا تو دلّی کے مسلمانوں نے انہیں ان کے مرنے پر کسی قبرستان میں دفن نہیں کرنے دیا تھا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور پولیس کی نگرانی میں ان کی میت دفن کی گئی۔

عربک اسکول میں میں نے چار سال پڑھا۔ ساتویں جماعت میں ہمارے کلاس ماسٹر تھرڈ ماسٹر کہلاتے تھے۔ یہ بھی عجیب مرکھنے تھے۔ چالیس پچاس لڑکوں کی کلاس کو اس سرے سے اس سرے تک اُدھیڑ کر رکھ دیا کرتے تھے۔ ناک چپٹی تھی اس لئے "نکٹے" کہلاتے تھے۔ اسکول کے لڑکے بڑے شریر ہوتے ہیں۔ ماسٹروں کے نام ایسے موزوں رکھ دیتے ہیں کہ چپک کر رہ جاتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب فضل الدین دلّی کے تقریباً کل مسلمان خاندانوں کے اُستاد تھے۔ اسکول میں تو لڑکوں کی نگرانی کرتے ہی تھے شہر میں بھی ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک عجیب وصف ان میں یہ تھا کہ جب کسی طالب علم کو ان کا خیال آجاتا تھا کہ کہیں ہیڈ ماسٹر صاحب نہ آجائیں۔ اسی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب نمودار ہوجایا کرتے تھے۔ لہٰذا لڑکوں نے ان کا نام "قطب" رکھ دیا تھا۔ ایک ماسٹر صاحب تھے جو اس طرح بولتے تھے جیسے ان کے منہ میں کوئی چیز بھری ہوئی ہو۔ ان کا نام "آلو" رکھ دیا گیا تھا۔ ایک اور صاحب تھے جن کی شکل اور ڈاڑھی چینیوں جیسی تھی۔ ان کا نام "فیچو" پڑ گیا تھا۔ ایک "دوزخ کے چیونٹے" تھے۔ اور ایک اور صاحب "اللہ میاں کی اونٹنی"۔

دسویں جماعت میں کچھ تو پڑھا کم اور کچھ اس وجہ سے کہ امتحان سے تین مہینے پہلے ابّا نے میری شادی کردی میٹرک میں فیل ہوگیا۔ اس سال ہمارے اسکول کا نتیجہ بہت بُرا رہا تھا۔ شاید ۱۲۰ لڑکوں میں سے ۲۳ پاس ہوئے تھے۔ ابّا نے مجھے اور منجھلے بھائی کو عربک اسکول سے اٹھا کر مشن اسکول میں داخل کردیا۔ اگلے سال ۱۹۲۲ء میں میں نے اچھے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کرلیا۔

ابّا کی یہ خواہش تھی کہ ہم میں سے کوئی وکیل بنے، کوئی ڈاکٹر اور کوئی انجنیئر۔ بڑے بھائی منظر احمد نے وکالت کو پسند کیا، منجھلے بھائی نے انجنیئری کو اور میں نے ڈاکٹری کو۔ بڑے بھائی نے بی۔ اے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی پاس کرلیا اور رام کشور ایڈوکیٹ کے ساتھ کار آموزی بھی کی۔ مگر ان کی زبان میں لکنت ہے اس لئے ایک کل ہند مقابلہ میں بیٹھے اور انہوں نے سب پرچوں میں بہت اچھے نمبر لئے۔ زبانی امتحان میں لکنت ہی کی وجہ سے انہیں کم نمبر ملے۔ لہٰذا منتخب نہیں ہوسکے مگر گھر بیٹھے اپنی نمبروں کی بنیاد پر ان کے پاس ریلویز سے آفر آگیا اور بعد میں ترقی کرتے کرتے ریلویز کے صدر محاسب ہوگئے اور اب کے ڈی۔ اے میں مشیر مالیات ہیں۔ منجھلے بھائی میٹرک سے بددل ہوکر حیدرآباد چلے گئے اور سب انسپکٹر پولیس ہوگئے۔ جب حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا تو وہ اضلاع میں ایس پی تھے۔ زوال حیدرآباد کے بعد سخت معتوب ہوئے۔ بمشکل قید ہونے سے بچے مگر ملازمت سے برخاست کئے گئے۔ ہندوستان کے ہندوستان ہی میں رہے اور دلّی میں ان کی تین چار لاکھ کی جائداد کسٹوڈین نے ضبط کر کے کوڑیوں کے مول نیلام کردی۔ بینک میں ان کا چالیس پچاس ہزار روپیہ تھا وہ بھی ڈوبا۔ اذیت ناک حالات میں وہیں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

چچا اشرف حسین کے دو لڑکے تھے، ایک افضل حسین اور دوسرے اجمل حسین۔ افضل حسین محکمہ زراعت میں تھے اور اجمل حسین ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر اجمل سے میری بہن بشریٰ کی شادی ہوئی تھی۔ جب میں نے ۱۹۲۲ء میں میٹرک پاس کیا تو ڈاکٹر صاحب لاہور کے میڈیکل کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کے مشورے سے ابا نے مجھے لاہور کے ایف سی کالج میں داخل کر دیا۔ ابا خود مجھے لے کر لاہور گئے تھے۔ ابا جی کے ساتھ جا کر میں نے پیسہ اخبار کے ایڈیٹر محبوب عالم مرحوم اور ممتاز علی مرحوم، ایڈیٹر تہذیب نسواں کو پہلی بار دیکھا۔ ان دونوں بزرگوں سے ابا کے گہرے تعلقات تھے۔ تہذیب نسواں کے دفتر میں تاج، پطرس اور سالک کو دیکھا جن سے کوئی دس سال بعد خود میرے اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ اسی دفتر میں حفیظ جالندھری، غلام عباس اور چراغ حسن حسرت سے ملاقات ہوئی تھی۔

ایف سی کالج سے میں نے ایف ایس سی (میڈیکل) پاس کیا۔ ابا کا ارادہ مجھے ایڈنبرا بھیجنے کا تھا مگر دو بڑے حادثے یکے بعد دیگرے اسی زمانے میں پیش آ گئے۔ ابا کی دائیں طرف فالج کا اثر ہو گیا اور وہ اسے موت کا پیام سمجھنے لگے تھے۔ پہلے جاپے کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ میری بیوی کو پلوریسی ہوئی اور اس نے اتنا طول کھینچا کہ ان کا ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ ڈاکٹر اجمل کے مشورہ سے انہیں لاہور لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی کے ہاں میرا قیام تھا۔ دو ایک دن بعد ڈاکٹر صاحب چار اور ڈاکٹروں کو گھر لے آئے۔ انہوں نے معائنہ کیا۔ پھیپھڑے کے غلاف میں سے پانی نکالا۔ اس کا معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں پیپ پڑ گئی ہے۔ اس لئے یہ ایک اور مرض ہو گیا ہے جس کا نام ایمپائما ہے۔ تجویز آپریشن کی ہوئی۔ گھر پر ہی آپریشن ہوا۔ دائیں جانب کی دو پسلیاں کاٹ ڈالی گئیں اور زخم کو دھو کر ٹانکے لگا دیئے گئے۔ مگر زخم نہیں بھرا اس لیے ٹانکے کاٹ کر اسے کھلا زخم بنا دیا گیا۔ ربڑ کی نلکی کا بالشت بھر ٹکڑا زخم میں ڈال دیا گیا اور روزانہ اس کی ڈریسنگ ہونے لگی۔ دو مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ صحت بالکل گر گئی اور کوئی امید زیست کی نہ رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر کہہ دیا کہ انہیں دلی لے جا کر لیڈی ہارڈنگ زنانہ ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ مریضہ کو نئی دلی کے لیڈی ہارڈنگ ہسپتال میں داخل کر دیا۔ ابا نے روپے کا بالکل منہ نہیں کیا۔ بڑے اچھے کمرے میں انہیں رکھا۔ بچے پر ایک تجربہ کار دایہ رکھی۔ میں انہیں داخل کرا کے لاہور چلا آیا۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت تو تھی ہی مگر اب محبت سے زیادہ ان پر ترس آتا تھا کہ الٰہی یہ کس عذاب میں گرفتار ہو گئیں۔ زندگی کی کوئی آس نہیں رہی تھی۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب ان کی شاؤنی آتی ہے کہ اب آتی ہے۔ مگر اللہ کی شان کہ وہاں ایک سکھ ڈاکٹرنی نے اس توجہ سے ان کا علاج اور ڈریسنگ کی کہ وہ روبصحت ہونے لگیں۔ جب میں کوئی چار یا پانچ مہینے بعد دلی گیا تو وہ بظاہر بالکل تندرست ہو چکی تھیں مگر پہلو کا زخم ناسور بن گیا تھا اور اس کے اچھے ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لیڈی ڈاکٹر گوبند کور نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ یہ مرض کیا ہے اور کیوں اچھا نہیں ہو سکتا۔ اب صرف یہی کہا جا سکتا تھا کہ ناسور کو ربڑ کی ٹیوب کے ذریعہ روزانہ دھویا جائے۔ اور عام صحت کو گرنے نہ دیا جائے۔ بیوی ہسپتال ہی میں رہیں اور میں نے لاہور جا کر میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ابا اور بیوی کی بیماری کی وجہ سے طبیعت ویسے ہی اچاٹ ہو رہی تھی کہ سڑے ہوئے مُردوں پر کام کرنا پڑا۔ گوشت کھانا چھوٹ گیا، ہاتھوں میں سے دواؤں کی بو آتی رہتی تھی۔ کام سے اور اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ میں نے ڈاکٹر اجمل سے کہا۔ "مجھ سے یہ پڑھائی نہیں چلے گی۔" انہوں نے ہمیشہ ہمت بندھائی مگر میں نے ابا کو لکھ دیا کہ آپ کی خواہش کی تکمیل میں میں نے ڈاکٹری پڑھنی شروع کی مگر یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔" ابا کو افسوس ہوا مگر انہوں نے مجھ سے اصرار نہیں کیا۔ خط لکھوا دیا (فالج کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکتے تھے) کہ نہیں پڑھ سکتے تو دلی آ جاؤ۔ میں نے کتابیں اور ہڈیوں کا ڈھانچ اونے پونے ہم جماعتوں

کے ہاتھ بیچا اور گھر چلا آیا۔ ابا آدھے بھی نہیں رہے تھے میں اُن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ ابا نے پیار کیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ پوچھا: "اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے کہا: "بی۔ اے اور ایم۔ اے کروں گا۔" بولے "اچھا، جیسی تمہاری مرضی۔"

ابا تھوڑا سا چل پھر لیتے تھے۔ اس لاچاری میں بھی دوسرے ہسپتال کا پھیرا کبھی کبھی کر لیتے تھے۔ شام کو میں ابا کے ساتھ ہسپتال گیا۔ بیوی کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ گو بند کور سے ابا نے اور میں نے باتیں کیں۔ انہوں نے کہا: "آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔ میں دوائیں لکھ دوں گی اور ڈریسنگ کا طریقہ بتا دوں گی۔" اگلے دن انہوں نے میرے سامنے ڈریسنگ کی۔ پہلو میں ایک سوراخ تھا جس میں ٹیوب پڑی ہوئی تھی۔ اس ٹیوب کو نکال کر دوسری صاف ستھری ٹیوب زخم میں ڈالی گئی اور بڑی پچکاری سے زخم کو دھو کر گاز اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی۔ ڈریسنگ دن میں صرف ایک دفعہ کرنی تھی۔ بیوی گھر آگئیں اور چودہ سال تک میں ان کی ڈریسنگ کرتا رہا۔ دیکھنے والوں کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان کے پہلو میں ناسور ہے۔ اسی سال میں ان کے ہاں پانچ بچے اور ہوئے مگر یہ ناسور ان کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتا رہا۔ دنیا بھر کے علاج کر لیے، حیدر آباد لیجا کر ایک پہاڑ میں رہنے والے سادھو کو بھی دکھایا، اس کی دوا بھی استعمال کی، کچھ نقصان ہی ہوا۔

دلی کے مشہور سرجن ڈاکٹر جوشی کو دکھایا اس نے کہا: "اب صرف یہی صورت ممکن ہے کہ میں ان کی ایک طرف کی پوری بارہ پسلیاں نکال دوں۔" بیوی بچاری اس پر بھی راضی ہو گئی تھیں مگر تین دن ہسپتال میں رکھنے کے بعد ڈاکٹر جوشی نے بھی جواب دے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنے بڑے اپریشن کے بعد بھی یقین نہیں ہے کہ ناسور نہیں رہے گا۔ پھر اس اپریشن میں جان جانے کا بھی خطرہ تھا۔ لہٰذا روزانہ کی ڈریسنگ ہی پر زندہ رہیں۔ اور ایک دن وہ آیا کہ ایک دم سے بتاشے کی طرح بیٹھ گئیں۔ سارے جسم میں ناسور کا زہر پھیل گیا اور تین دن کی شدید تکلیف کے بعد رخصت ہو گئیں۔

بیمار بیوی کی خدمت کرنا تو خیر میرا فرض تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی جو میں بیزار ہو جاتا تھا اور بُرے بُرے خیالات دل میں لاتا تھا تو شاید اللہ میاں مجھے اس لئے معاف کر دیں کہ میں نے اپنی دائم المرض بیوی کو سوکن کا دُکھ نہیں پہنچایا۔ حالانکہ دو تین بیسیوں لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند تھیں۔ میں ان سب کو بہلاتا ہی رہا اور ان سے محبت جتاتا رہا۔ مگر بیوی کے انتقال کے بعد بھی میں نے ان میں سے کسی سے شادی نہیں کی، اور نہ اپنی بھری جوانی میں کوئی بے راہ روی اختیار کی۔ ویسے دس سال کی عمر سے میں افلاطونی عشق کا مریض ہوں اور چاہنے سے زیادہ چاہا گیا ہوں۔ حد یہ ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد بعض شادی شدہ سابقہ محبوبائیں اس پر بھی آمادہ تھیں کہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لیں۔ جگ

اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی

دلی آجانے کے بعد میں نے بی۔ اے (آنرز) انگریزی ادبیات میں کیا اور فارسی (آنرز) کے دو پرچے بھی کئے۔ ہندو کالج اور مشن کالج دونوں کشمیری دروازے کے قریب آمنے سامنے تھے۔ دونوں میں ہماری کلاسیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں مشن کالج میں ایم اے (فارسی) میں داخلہ لیا۔ میں اس مضمون کا اکلوتا طالب علم تھا۔ یہاں کے استادوں میں دو قابل ذکر ہیں۔ ایک ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (حال وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) اور دوسرے شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن مرحوم۔ ڈاکٹر قریشی نے دو ایک ہی سبقوں میں اندازہ لگا لیا کہ مجھے ان سے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا مجھ سے کہہ دیا کہ اگر آپ کوئی دشواری محسوس کریں تو مجھ سے پوچھ لیا کریں۔ اس کی نوبت کبھی نہ آئی۔

شمس العلماء دراصل عربی کے پروفیسر تھے، وہ مروّت میں مجھے پڑھاتے تھے کیونکہ دادا ابّا کی سفارش پر انہیں مشن کالج میں پروفیسری ملی تھی۔ مگر انہوں نے شرط یہ لگائی کہ علی الصباح میرے گھر آجایا کرو۔ میں نے مولوی صاحب سے کچھ کم ایک سال پڑھا۔ غضب کا حافظہ تھا ان کا۔ منہ لپیٹے پڑے رہتے اور وقایۂ نعمت خانِ عالی اور اخلاقِ جلالی جیسی دقیق کتابیں مجھ سے آگے آگے "منہ زبانی" پڑھتے جاتے۔ ترجمہ میں انگریزی میں کرتا جاتا۔ مولوی صاحب انگریزی نہ تو لکھ سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے مگر مجھے ٹوک کر ایسا صحیح لفظ بتاتے کہ میرا انگریزی دانی کا سارا گھمنڈ کرکرا ہو جاتا۔ رمضان کا مہینہ تھا، ایک دن مولوی صاحب خبر نہیں کس موج میں تھے کہ مجھ سے اڑ گئے۔ مجھے عربی نہیں آتی تھی اس لئے اخلاقِ جلالی اٹک اٹک کر پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ بالکل ہی نہیں چلی تو میں رُک گیا۔ مولوی صاحب کمبل اوڑھے اوڑھے بولے "رُک کیوں گئے؟" میں نے کہا "جی عربی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"کیا خبر قرآن کی کوئی آیت ہی ہو۔"

"جی تو پھر؟"

"غلط سلط پڑھوں گا تو گناہ ہوگا۔"

"جی آپ پڑھئے، گناہ ثواب مجھ پر۔"

میں نے فراٹے کے ساتھ اُردو کی طرح عربی کو پڑھ دیا۔

مولوی صاحب بولے "سبحان اللہ! اور جناب ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں!"

مجھے مولوی صاحب کا یہ طعنہ بہت بُرا لگا۔ میں نے چیخ کر کہا "کیا یہ میرا قصور ہے کہ میں ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں پیدا ہوا، وہ ہوں گے عربی کے عالم فاضل، مجھے عربی نہیں آتی!"

مولوی صاحب نے محسوس کر لیا کہ مجھے ان کا کہنا ناگوار گزرا۔ رسان سے بولے "تو بھئی پہلے عربی پڑھ لو۔" پھر بولے۔

"ہاں پڑھو۔"

میں منہ تھتھا کر بیٹھ گیا۔

پھر انہوں نے کہا "جی پڑھئے۔"

میں نے کہا "میں نہیں پڑھتا وڑھتا۔ اور میں کل سے نہیں آؤں گا۔"

مولوی صاحب اٹھ بیٹھے۔ بولے "جناب کو غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔"

اس کے بعد مولوی صاحب بہت دیر تک سمجھاتے بجھاتے رہے۔ مگر میں "سلام علیکم" کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ پھر نہ مولوی صاحب کے ہاں گیا اور نہ کالج گیا۔

کئی مہینے بعد مولوی صاحب لال کنواں کے بازار میں سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ میں اپنے ماموں حشمتی صاحب کے ساتھ جا رہا تھا، میں کترا کر نکل جانا چاہتا تھا کہ حشمتی صاحب نے السلام علیکم کہہ کر مولانا کی طرف مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔

مولانا نے کہا : "نہیں، پہلے ناراض استاد زادہ سے ۔" یہ کہہ کر میری طرف ہاتھ بڑھا دیا ۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لیا تو انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور فرمایا : "میاں تم تو سچ مچ ناراض ہی ہو گئے ۔" اور مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

ابا نے ہم میں سے ہر ایک کے لیئے بنک میں پچاس پچاس ہزار روپیہ چھوڑا تھا ۔ جائداد کا کرایہ الگ تھا جو تقسیم ہونے کے بعد فی لڑکا کوئی تین سو روپے مہینہ ہوتا تھا ۔ یہ تین سو روپے اس زمانے کے ہیں، جب بیس سیر کا آٹا ۔ روپے سیر گھی ، چار آنے سیر بکری کا گوشت، آٹھ سیر کا دودھ ، ۱۲ سیر کی شکر اور کنجڑے کے ہاں سے ایک پیسے میں چار سودے ملتے تھے ۔ میری شادی پر انیس روپے تولا سونا تھا ۔ گریجویٹ کو اگر چالیس روپے کی ملازمت مل جاتی تھی تو اسے کھاتا پیتا آدمی سمجھا جاتا تھا ۔ لہٰذا ہم اپنے آپ کو رئیس زادہ سمجھتے تھے نوکری کرنے کا میں نے کبھی خیال نہیں کیا ۔ بڑے بھائی ملازم ہو چکے تھے ، منجھلے بھائی حیدر آباد جا چکے تھے ۔ خیال تھا کہ دادا ابا اور ابا کی کتابیں ہی اتنی ہیں کہ اگر کتب خانہ ہی کا کام سنبھال لیا جائے تو سینکڑوں روپے مہینے کی یافت ہو سکتی ہے ۔ ڈگری لینے کے بعد میں نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا۔

میاں انصار ناصری جو مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں خان بہادر میر ناصر علی، صاحب "صلائے عام" کے پوتے ہیں اور رشتے میں میرے بھانجے ہیں، میرے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے ۔ انہیں بھی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور مجھے بھی ۔ انہوں نے ایک دن کہا کہ لاہور سے کیسے اچھے اچھے رسالے نکل رہے ہیں ۔ ہمایوں، نیرنگِ خیال، عالمگیر اور ادبی دنیا ۔ مگر دلّی سے کوئی اچھا پرچہ نہیں نکلتا ۔ یہ بات گھٹی میں اتر گئی اور ہم اس پر آمادہ ہو گئے کہ رسالہ ہم نکالیں ۔ فوراً جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کو خط لکھنے بیٹھ گئے کہ ہم ایک رسالہ نکال رہے ہیں، اس کے لئے مضمون بھیجو ۔ نام بہت سوچے ۔ میاں انصار نے کہا : ساغر ہے، پیمانہ ہے ، صہبا ہے ، مینا ہے ، مگر ساقی نہیں ہے ۔ " میں نے کہا تو بس ساقی ہی نکالیں گے ۔ ڈیکلریشن لے لیا اور کام شروع کر دیا ۔ رتی بھر تجربہ نہیں تھا ۔ دوسروں کے سہارے کام کیا ۔ ڈھائی تین سال میں پچیس ہزار روپے کا گھاٹا ہوا ۔ بڑے بھائی نے بلا کر پاس بک اور چیک بک حوالے کی اور کہا تم جانو اور تمہارا کام شاید دو ڈھائی ہزار روپے بنک میں باقی رہ گئے تھے ۔ پریس اور کاغذی کے واجبات ادا ہونے کے بعد کوئی پانسو روپے بچے ۔ شام کو انصار اور فضل حق قریشی حسبِ معمول آئے تو انہوں نے مجھے خاموش اور افسردہ پایا ۔ میں نے انہیں بتایا کہ ساقی بند کرنا پڑے گا ۔ فضل حق نے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ساقی بند ہو ۔ آپ حساب کتاب خود سنبھالیئے ۔ یہ سارا روپیہ خورد برد ہوا ہے اور واقع اسی بچے ہوئے پانسو سے پرچہ چلتا رہا اور اسی کی اُلٹ پھیر میں میں نے کتابوں کا کام شروع کیا جو پندرہ سال میں بڑھ کر تقریباً سو گنا کو پہنچا اور روپے کی ریل پیل ہو گئی ۔ مجھے اپنے کاروبار سے پندرہ سو سے دو ہزار تک کی ماہوار آمدنی تھی کہ سنہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا اور یہ سارا کاروبار اس کی بھینٹ چڑھ گیا ۔ اس انقلاب میں جائداد بھی گئی، مسلمانوں کے ایک بنک میں روپیہ تھا، وہ بھی ڈوبا اور ہم بیک بینی دو گوش مرتے گرتے لاہور پہنچ گئے ۔

دلّی سے لاہور تک پہونچنے میں ہم پر کیا گزری؟ اسے میں نے تفصیل سے "دلّی کی بپتا" میں لکھ دیا ہے ۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ۵ ستمبر سے ۱۵ ستمبر تک ہم گھر میں مقید رہے ۔ اس کے بعد ایک فوجی ٹرک میں رائفلوں کی حفاظت میں گھر سے نکل کر پرانے قلعہ میں کھلے آسمان تلے جا پڑے ۔ تین دن قلعہ میں رہے، جہاں اسی ہزار دلّی والے اس طرح بند تھے جیسے چوہے دان میں چوہے ۔ شہر میں مسلمانوں کے محلے کے محلے

صاف ہو چکے تھے ۔ قرول باغ سبزی منڈی ، پہاڑ گنج میں نام کو مسلمان نہیں رہا تھا ۔ فوجی گولیاں چلا رہے تھے اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا ۔ پرانا قلعہ بھر گیا تو ہمایوں کے مقبرے میں مسلمان بھرنے شروع ہوئے اور ایک لاکھ آدمی اس میں بھی سما گئے ۔ بے موسم کی بارش ہو رہی تھی ۔ ہیضہ پھیلا ہزاروں اس کی بھینٹ چڑھ گئے ۔ ہمارے ریلوے کے پاس نکل آ گئے تو تین دن پرانے قلعہ میں رہنے کے بعد ہمیں ایک ٹرک میں بھر کر نظام الدین کے اسٹیشن پر پہونچایا گیا ۔ یہاں ایک تھرڈ کلاس گاڑی میں اوپر تلے ٹھونس دیا گیا ۔ سب کی تلاشی کے بعد ریل روانہ ہوئی تو خیال یہی ہوا کہ رات کے ۹ بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے مگر شام سہارنپور ہی پر ہو گئی ۔ ریل میں اندھیرا رہا ۔ ریل چوں کی چال چلتی رہی ۔ گرمی ، بھوک اور پیاس سے بچے بلک رہے تھے ۔ بڑے چڑ چڑے ہو کر لڑنے مارنے پر آمادہ ہو رہے تھے مگر نیند نے سب پر غلبہ پایا ۔ بیٹھے ہی بیٹھے کوئی اونگھ گیا اور کوئی سو گیا کہ رات کے دو بجے گاڑی ایک دم سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی ۔ ایک شور قیامت برپا ہو گیا ۔ خبریں آ چکی تھیں کہ گاڑیاں کٹ رہی ہیں ۔ بچے دھاڑنے لگے ، عورتیں چیخنے لگیں ، مرد انہیں خاموش کرنے کے لئے ان دونوں سے زیادہ چیخنے لگے ۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ ساری کھڑکیاں چڑھ گئیں اور ان کے آگے سامان چنا جانے لگا ۔ باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں ۔ کسی کی ماں نے دھونسا کھایا تھا کہ باہر جھانک کر دیکھتا ۔ ویسے ہی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے ۔ حبس اور گرمی کا یہ حال ہو گیا کہ چوٹی کا پسینہ ایڑی میں آنے لگا ۔ باہر موت ناچ رہی تھی اور ہم ہر گھڑی یہ سوچ رہے تھے کہ اب ہماری باری آئی کہ اب آئی ۔ ایک گھنٹے تک یہی کیفیت رہی ، اس کے بعد گولیاں چلنی بند ہو گئیں اور گاڑی کھسکی اور کھسک کر لدھیانہ کے اسٹیشن پر پہونچی تو باہر سے آواز آئی کہ اب گاڑی صبح کو یہاں سے روانہ ہو گی ۔ جو پلیٹ فارم پر اترنا چاہے اتر سکتا ہے ۔ ڈبوں میں جام ہونے والے لوگ کھڑکیوں میں سے کود کود کر اترنے لگے ۔ میں بھی اترا ۔ دیکھا کہ ہم سے ایک ڈبہ آگے تک چھ ڈبے بالکل خالی پڑے ہیں اور پلیٹ فارم پر کئی عورت مرد زخمی پڑے تڑپ رہے ہیں ۔ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں نے آدھی ریل لوٹ لی اور مسافروں کو مار ڈالا ۔ پندرہ منٹ اور انہیں لوٹنے کے مل جاتے تو ہمارا ڈبہ بھی صاف ہو جاتا ۔ زندگی تھی بچ گئے ۔

دس بجے کے بعد گاڑی چلی اور دو گھنٹے چل کر جنگل میں رک گئی ۔ معلوم ہوا کہ انجن میں اب دم نہیں رہا ۔ دوسرا انجن آئے گا تو ریل کو لے جائے گا ۔ کئی گھنٹے گاڑی کھڑی رہی ۔ دوسرے انجن نے آکر اسے امرتسر پہنچایا ۔ ایک گھنٹہ یہاں بھی کھڑی رہی اور سکھ بلبلائے بلبلائے پھرتے رہے ، مگر فوجی دستے کی وجہ سے دور رہے ۔ مغرب کے وقت گاڑی پاکستان میں داخل ہوئی ۔ تو اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے ۔ رات کو آٹھ بجے کے بعد لاہور پہنچے تو کئی لاکھ مہاجر اسٹیشن پر اور باہر دور تک پڑا ہوا تھا ۔ شہر میں کرفیو تھا اس لئے رات پلیٹ فارم کے ایک کونے میں گزاری ۔ بیوی بچے تھک کر چور ہو گئے تھے پڑ کر سو گئے ۔ صبح کو تانگا کر کے مشہور ادیب ایم اسلم کے گھر پہنچے ۔ وہ اطلاع پاتے ہی گھبرا کر نکل آئے اور ہمیں جو بُرے حال اور بانکے دھیاڑے دیکھا تو آب دیدہ ہو گئے ۔ فوراً اپنا بالاخانہ کھلوایا اور ہمیں اوپر پہنچایا ۔ اپنے مکان سے قریب ایک مکان مجھے الاٹ کرا دیا ۔ مگر اس میں جانے نہ دیا ۔ بیس بائیس دن اپنے ہاں سب کو مہمان رکھا ۔ اس کے بعد ہم اپنے گھر میں آ گئے ۔

دس مہینے لاہور میں رہے مگر سارے عزیز کراچی چلے گئے تھے اس لئے ہم نے بھی کراچی کو ترجیح دی ۔ دو سال کی بیکاری میں کل اندوختہ ختم ہو گیا ۔ چند ہمدرد دوستوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے ریڈیو پاکستان میں نگرانِ موسیقی رکھوا دیا ۔ میری دوسری بیوی میٹرک پاس تھیں ۔ انہوں نے ایک اسکول میں نوکری کر لی ۔ اور شام کو ایک کالج میں پڑھنے بھی لگیں ۔ انہوں نے چپ چپاتے چھ سال میں ایم اے کر لیا ۔ خدا کے فضل

سے ایک آسودہ حال گھر کی صورت بن گئی۔

میرے خاندان میں دور دور تک موسیقی سے کسی کو لگاؤ نہیں ہے مگر مجھے بچپن ہی سے اس کا شوق ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ابا نے میرا جیب خرچ بیس روپیہ مہینہ کر دیا تھا۔ میں نے دس روپے مہینہ ایک استاد کو دے کر باقاعدگی سے ہارمونیم اور راگ راگنیاں سیکھنی شروع کر دیں۔ ۲۵ سال تک میں اچھے استادوں سے دلّی میں گلوکاری اور ساز موسیقی سیکھی۔ ۱۹۳۷ء سے ریڈیو پر گانا بھی شروع کر دیا تھا مگر ایس۔ احمد کے نام سے۔ کیونکہ میرے خاندان والے اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ بہرحال سے دینا کچھ مشکل ہے۔ میں نے اس فن کو حاصل کرنے میں بہت وقت اور روپیہ صرف کیا۔ یوں سمجھئے کہ میرا آدھا وقت ادب میں اور آدھا تحصیلِ موسیقی میں گزرا۔ کلاسیکی موسیقی ایک نہایت دشوار علم اور فن ہے۔ جسے کماحقہٗ حاصل کرنا عطائی کے لیئے تقریباً ناممکن ہے۔ مگر میں نے مشق و مزاولت سے اچھے استادوں کی رہنمائی میں اس فن کے عملی پہلو پر عبور حاصل کیا اور اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں سے اس کے علمی پہلو پر دسترس حاصل کی اور ایک وقت وہ آگیا کہ اکثر پیشہ ور فن کار مجھ سے راگ راگنیوں کی صحت کرنے آنے لگے۔ آل انڈیا ریڈیو کے بیشتر اور پاکستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے میرے پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہونے کے بعد سینکڑوں غنا یئے لکھے اور چھ سال سے موسیقی کے آسان سبق ہفتہ وار نشر کر رہا ہوں کہ مسلمانوں کا یہ ساختہ پرداختہ بے مثل فن ناقدری اور کس مپرسی کا شکار نہ ہو جائے۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ موسیقی کہاں سے اور کیوں میرے پیچھے لگ گئی۔ گو میں اس معمہ کو حل نہ کر سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ میں اس شوق میں پڑ کر تقریباً سبھی برائیوں سے بچا رہا۔ ادب اور موسیقی کے علاوہ میرا اور کوئی مشغلہ ہی نہ رہا۔ سینما، تھیٹر، کلب، ریس، شراب، جوا، کوئی بازی، کسی کے لیئے کوئی فرصت ہی نہیں ملی۔ پاکستان بننے کے بعد اس کی سمجھ میں آئی تو یہ آئی کہ ادب ذریعہ معاش نہیں بن سکے گا۔ دلّی میں بھی نہیں تھا، مگر جائداد، کاروبار اور سرمایہ سے محروم ہونے کے بعد موسیقی ہی کے سہارے زندگی بسر کرنا مقدر تھا اس لیئے مجھے اس آنے والے دور کے لیئے تیار کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اور پروفیسر بننے کے بدلے ادیب اور موسیقار بنا۔ یہ مقدرات ہیں جن میں دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

میری ادبی خدمت کی عمر بھی چالیس سال ہے۔ ساقی کو جاری ہوئے اب پورے ۴۲ سال ہو چکے ہیں۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا مجھے اچھا نہیں لگتا اس لیئے مجھ سے مت پوچھئے کہ ساقی نے اردو کو کیا دیا؟ میرے ہم عصروں سے پوچھ لیجئے یا ۴۲ سال کے فائل دیکھ لیجئے۔ ساقی ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ بیس پچیس سال پہلے ساقی فیشن میں داخل تھا۔ گھر گھر ساقی کا چرچا تھا۔ دنیائے ادب سے متعارف ہونے کے لیئے ضروری تھا کہ ساقی میں اپنی چیزیں شائع کرائی جائیں۔ ہر عروج کے بعد زوال ہوتا ہے ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں ساقی پر بھی ادبار چھایا۔ لاہور پہنچتے ہی میں نے ڈیکلریشن کی درخواست دے دی تھی، مگر پریس برانچ میں چوہدری محمد حسین بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے دس مہینے جھلایا اور ڈیکلریشن نہیں دیا۔ یہ وہی بزرگ تھے جو علامہ اقبال کی صحبت میں رہ کر بھی اپنی اصلاح نہ کر سکے۔ بے باک اور جدت پسند ادیبوں کو گرفتار کرانا اور ان پر فحش نگاری کے مقدمے چلانا ان کا شیوہ تھا۔ منٹو اور عصمت چغتائی سے انہوں نے باپ مارے کا بیر باندھ لیا تھا۔ ان کی رپورٹ پر تلاشی اور گرفتاری کے وارنٹ لاہور سے جاری ہوتے۔ لاہور، بمبئی اور دلّی پر پولیس چھاپہ مارتی۔ ایڈیٹروں، پبلشروں اور کتب فروشوں کی بھی پولیس تلاشی لیتی اور لکھنے والوں کے ساتھ انہیں بھی گرفتار کرتی۔ ضمانتیں

لیتی اوران پر مقدمے قائم کر کے لاہور کھینچ بلاتی ۔ ایک دفعہ مجھ پر بھی ان کی نظر کرم ہوئی ۔منٹو کی کتاب دھواں اور عصمت کی کتاب چوٹیں میں نے شائع کی تھی ۔ مجھے پیشن گوئی مل گئی تھی کہ پنجاب کی سی آئی ڈی چھاپہ مارنے والی ہے ۔میں نے یہ کتابیں اپنے کتب خانے سے ہٹوا دیں ۔ ایک دن ایک سب انسپکٹر صاحب دلی پولیس کے چند سپاہی ساتھ لے کر آدھمکے ۔ مجھے وارنٹ دکھایا اور کہا کہ" میں نے آپ کو گرفتار کر لیا ہے ۔"

میں نے کہا " تو پھر؟ "

بولے " پانچ ہزار کی شخصی ضمانت دیجئے ۔"

میرے پاس میرے رشتے کے بھائی علامہ مضحک بیٹھے ہوئے تھے ۔انہوں نے ضمانت کا کاغذ لکھ دیا ۔اس کے بعد انہوں نے دفتر کی تلاشی لی ۔ وہاں کیا رکھا تھا ۔ بے نیل و مرام چلے گئے ۔ ان کے دو مہینے بعد ایک دن جو میں اپنے دفتر آیا تو دیکھا کہ ایک سردار جی تلاشی لینے کے بعد خالی ہاتھ میرے پاس آئے ۔ بولے "آپ ہی شاہد احمد ہیں ؟ "

میں نے کہا " جی ہاں "

پوچھا " دھواں اور چوٹیں کہاں رکھی ہیں ؟ "

" ہٹا دیں ہیں ۔ "

بہت متعجب ہو کر بولے : ہٹا دی ہیں ؟ "

" جی ہاں ۔"

" کیوں ؟ "

" کیونکہ آپ آنے والے تھے ۔"

" آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟ "

" اپنی سی آئی ڈی سے ۔"

وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر ڈھیلے پڑ گئے " بھئی ہمیں تو ایک ایک کتاب پڑھنے کے لئے دے دیجئے ۔"

" کتابیں دینے والے شکار پور میں رہتے ہیں ۔"

پھر بڑے زور سے ہنسے اور بالکل ہی کھل گئے " آپ تو بڑے ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ مجھ سے پہلے بھی ایک سب انسپکٹر آپ کی تلاشی لے کر خالی ہاتھ چلا گیا ۔ مجھے کچھ تو دیجئے ۔"

میں نے کہا " میں آپ کو صرف بیان دے سکتا ہوں ۔"

بچارا بہت زچ ہوا ۔ضمانت اور بیان لے کر چلا گیا ۔ دو مہینے کے بعد ہم سب کے نام لاہور کی عدالت سے سمن آ گئے ۔میں میرا منشی اور کاتب سب ملزم ٹھہرائے گئے ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پریس کے مالک اور چند کتب فروش بھی پھانس لئے گئے ہیں ۔ دس بارہ ملزموں کی پوری برات تاریخ پر لاہور پہنچی ۔ عدالت نے اگلی تاریخ دے دی ۔ اسی طرح ہم سب کو کئی پھیرے کرائے گئے ۔ ایک پیشی پر منٹو

اور عصمت بھی بمبئی سے آگئے۔ کافی فیس دیکر ہم سب نے ایک ہندو ایڈوکیٹ کو اپنا وکیل بنایا۔ بیان ہوئے۔ جرح ہوئی۔ سارے ادیب تو ہمارے صفائی کے گواہ تھے، پولیس نے دو گمنام اخبار نویسوں کو گواہی میں پیش کیا تو وہ بچارے ٹھیک سے اردو بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ وکیل نے انہیں ایک مضحکہ بنا دیا۔ رائے بہادر صاحب جو کرسئ عدالت پر بیٹھے تھے مسکراتے رہے مگر انہیں حکومت نے ہدایت کردی تھی کہ سب پر جرمانہ ضرور کیا جائے۔ چنانچہ منٹو اور عصمت پر دو سو جرمانہ اور باقی سب پر بیس بیس روپے جرمانہ ہوا۔ میں نے سات سو روپے وکیل کو دے کر ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ جج انگریز تھا، اس کے سامنے کالی شلوار، دھواں اور لحاف کا انگریزی ترجمہ پیش ہوا تو اس نے فیصلہ لکھا کہ ان افسانوں میں کچھ بھی فحش نہیں۔ میں نے ان کتابوں کے نئے اڈیشن فوراً چھاپ دیئے۔ وکیل نے کہا۔ "آپ سب کے جرمانے واپس ہو سکتے ہیں۔ میں درخواست دے دوں؟"

میں نے کہا: "آپ جرمانے واپس لے لیجئے۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ میرا ان پیشیوں میں ضائع ہوا مگر میں خوش تھا کہ چوہدری صاحب کو منہ کی کھانی پڑی۔ منٹو پر انہوں نے اور بھی کئی مقدمے چلائے مگر شاید ایک ہی جرمانہ قائم رہا، باقی سارے مقدمے اپیلوں میں خارج ہو گئے۔ دلی میں ترقی پسند اور جدت پسند ادیبوں کا بڈا مجھے سمجھا جاتا تھا۔ جب سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک شروع کی تو ان کی خواہش کے مطابق میں نے ہی ترقی پسند مصنفین کی پہلی انجمن قائم کی تھی اور میں ہی اس کا سکریٹری تھا۔ رسالہ شاہجہاں کو میں نے اس انجمن کا آرگن بنا دیا تھا۔ جب اس کے مقاصد نے غلط رخ اختیار کیا تو میں نے اس انجمن کو ختم کر دیا اور "بزم تہذیب ادب" اس کے بدلے قائم کر دی جس میں پروفیسر مرزا محمد سعید جیسے جلیل القدر حضرات بھی شریک ہوتے تھے۔

اس بزم میں ڈرامہ اور اسٹیج کو بھی فروغ دیا۔ ہم نے چھ ڈرامے اسٹیج کئے اور کچھ رقم عربک کالج بلڈنگ فنڈ میں دی۔ میں نے بھی ان میں سے بعض ڈراموں میں ایکٹنگ کی تھی۔ کریپ کی داڑھی مونچھیں چپکانے سے میرا منہ سوج کر کپّا ہو گیا تھا۔ آٹھ دن تک گھر میں منہ چھپائے پڑا رہا تھا۔ اس کے بعد کے ڈراموں میں بنی بنائی داڑھی پہن کر پارٹ کرتا تھا۔ فضل حق قریشی ڈراموں کی روح رواں ہوتے تھے۔ مردانہ رول بھی ادا کرتے تھے اور زنانہ بھی۔ ان کے علاوہ جبار خانی، موسیٰ اقبال اور ماسٹر ممتاز حسین تھے۔ یہ تینوں حضرات بعد میں جماعت اسلامی میں شریک ہو کر تمام "خرافاتوں" سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

میں اتنی ادبی اور موسیقی کی انجمنوں کا صدر، سکریٹری یا مجلسِ عاملہ کا ممبر رہا ہوں کہ اب تو ان کی تعداد اور نام بھی یاد نہیں ہے۔ گوشہ گیری کے باوجود مجھے اب بھی بخشا نہیں جاتا۔ رانڈیں تو بیٹھتیں۔ بیٹھیں اگر رنڈوے بیٹھنے بھی دیں! شاہد احمد دہلوی کو نشان کا ہاتھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے، ورنہ میں تو ادب اور موسیقی کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ خرابی صحت اور بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود بھی جو خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے کرتا رہتا ہوں اور انشاء اللہ کرتا رہوں گا۔

۱۹۵۸ء کے اواخر میں جمیل الدین عالی کو ایک کل پاکستان جماعت ادیبوں کی بنانے کا خیال آیا تو انہوں نے چند مقامی مصنفین کو اپنے گھر بلایا۔ اس پہلے اجتماع میں صرف آٹھ ادیب شریک ہوئے تھے۔ قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، جمیل جالبی، عباس احمد عباسی، میں اور دو ایک اور۔ اس جماعت کے مقاصد پر گفتگو کرنے کے بعد اس کا نام پاکستان رائٹرز گلڈ

(ادارۂ مصنفین پاکستان) تجویز ہوا۔ مجھے اس کا کنوینر بنایا گیا۔ کیونکہ مجھے ادب میں تو پارٹی مین سمجھا جاتا تھا۔ میں نے پہلا کنونشن بلایا اور کوئی پانسو دعوت نامے جاری کئے۔ یہ دعوت نامے ہر زبان کے ادیبوں اور شاعروں کو بھیجے گئے تھے۔ خدا کے فضل سے سبھی شریک ہو گئے اور کراچی میں دو دن تک اس کی مختلف نشستیں ہوئیں، گرما گرم بحثیں ہوئیں، دستور بنا، گلڈ کی شاخیں کراچی لاہور، اور ڈھاکہ میں قائم ہوئیں۔ مشرقی پاکستان سے تقریباً ۲۵ ادیب اس کنونشن میں شریک ہوئے تھے۔ الیکشنوں میں بڑا ہنگامہ رہا۔ یہ بھی طے ہوا کہ مرکز کراچی میں رہے گا۔ مجھے مرکز کا ایک رکن چنا گیا۔ دو نشستوں کی صدارت پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کی۔ آخری نشست میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے نہ صرف شرکت فرمائی بلکہ جلسے سے نہایت حوصلہ افزا خطاب بھی کیا۔ گلڈ نے ہر زبان اور ہر خیال کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ یہی گلڈ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ حکومت نے ایک لاکھ روپے سال کی امداد گلڈ کے لئے منظور کی، اور یہ امداد غیر مشروط ہے۔ پاکستان میں گلڈ کی متعدد ذیلی شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور ادیبوں کی بہبود کے لئے گلڈ سر گرم عمل ہے۔ چار سال مرکزی گلڈ کی رکنیت کے بعد مجھے کراچی علاقائی گلڈ کا سکریٹری چنا گیا۔ یہ چل گلڈ کا سکریٹری مرکزی مجلس عاملہ کا رکن بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اب میرے سپرد گلڈ کی دو خدمتیں ہیں۔ جمیل الدین عالی گلڈ کے روح رواں ہیں۔ انہی کی کوششوں سے پچیس پچیس ہزار سالانہ کے آدم جی اور داؤد انعامات سال کی بہترین تصانیف پر ادیبوں اور شاعروں کو دینے کے لئے گلڈ کو حاصل ہوئے۔ سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ آجکل ہالینڈ میں پاکستانی سفیر ہیں۔ گو ہماری آنکھوں سے دور ہیں مگر ہمارے دلوں سے قریب ہیں۔

ایک قابل ذکر انجمن جس کی بنیاد مولانا رازق الخیری ایڈیٹر عصمت اور میں نے مل کر رکھی۔ انجمن ادبی رسائل پاکستان ہے۔ ادبی رسائل کا تعلق تہذیب و ثقافت سے ہوتا ہے اس لئے ان کے مسائل اخباروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اخباروں کی ایک سے زیادہ انجمنیں ہیں مگر ادبی رسائل کی کوئی انجمن نہیں تھی۔ اس کی ضرورت کو محسوس کر کے مولانا خیری نے مجھے یاد فرمایا اور مجھ سے مشورہ کیا۔ در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔ ہم نے کراچی کے تمام ادبی اور غیر فلمی رسائل کے ایڈیٹروں کو عصمت کے دفتر میں آنے کی دعوت دی اور مولانا نے اس انجمن کی ضرورت اور اس کے مقاصد بیان کئے۔ اتفاق رائے سے انجمن قائم ہو گئی اور وقتی طور پر مولانا خیری کو انجمن کا صدر اور مجھے سکریٹری چنا گیا۔ اس کی ایک مجلس عاملہ بھی بنا دی گئی اور ممبر سازی کی مہم شروع ہو گئی۔ ہم نے اس انجمن میں پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے ادبی رسائل کو شریک کر لیا۔ اردو، انگریزی، بنگالی، پنجابی، پشتو، بلوچی، سندھی اور گجراتی میں شائع ہونے والے ادبی رسالوں کو انجمن کا ممبر بنا لیا۔ ان کی تعداد کم و بیش ایک سو تھی۔ اس کا پہلا سالانہ جلسہ لاہور میں کیا گیا۔ ملک فیروز خاں نون اس وقت وزیر اعلیٰ پنجاب تھے۔ انہوں نے نہ صرف افتتاحی جلسے میں شرکت فرما کر حاضرین سے خطاب کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر اس انجمن کو غیر نفع ساز انجمن رجسٹر کرا لیا جائے تو پانچ ہزار کا عطیہ بھی دیں گے۔ انجمن رجسٹرڈ بھی ہو گئی اور عطیہ بھی مل گیا۔ انجمن نے اپنی بساط بھر رسائل کی خدمت کی۔ مثلاً جس زمانے میں کاغذ کا کال پڑا تو انجمن نے رسالوں کا کوٹہ حکومت سے مقرر کرایا بلکہ لاہور کے دو ایک بیلوں کو یہاں سے کاغذ بھی بھجوایا۔ سرکاری اشتہارات رسالوں کو نہیں ملتے تھے۔ محکمے کے سکریٹری سید ہاشم رضا صاحب سے اس قدغن کو دور کرایا۔ اور کئی رسالوں کو سرکاری اشتہارات ملنے لگے۔ کمپنیوں اور کارخانوں میں انجمن کے وفد گئے اور جو لوگ ان کے کرتا دھرتا تھے انہیں

باور کرایا کہ رسائل میں اشتہار دینا بھی ان کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ محکمہ اطلاعات کے جتنے بھی سکریٹری اور وزیر آئے سب سے مل کر ادبی رسائل کی اہمیت و افادیت انہیں بتائی اور انہیں رسالوں کی مشکلات کی طرف متوجہ کیا۔ مگر جب وہ انجمن کے لئے کچھ کرنے کو ہوئے تو ان کی وزارت ختم ہو گئی یا حکومت ہی بدل گئی۔ پچھلا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تھا جس میں اس وقت کے سکریٹری اطلاعات و نشریات سید ہاشم رضا صاحب نے اپنے خطاب میں بڑے کام کی باتیں کہیں اور اپنے محکمے سے انجمن کے اخراجات کے لئے روپیہ بھی دیا۔ لاہور میں جب بھی انجمن کا جلسہ ہوا انجمن کے سرگرم رکن محمد طفیل صاحب مدیر نقوش نے سارے انتظامات کئے اور بیشتر اخراجات بھی اپنے ذمہ لئے۔ اس انجمن سے جہاں اور کئی فائدے ہوئے یہ فائدہ بھی ہوا کہ تمام زبانوں کے ادبی کام کرنے والے مدیر ایک دوسرے سے قریب آ گئے اور ان کے بہت سے باہمی اختلافات دور ہو گئے۔ مگر حکومت کی نظر میں جو درجہ ادبی رسائل کو حاصل ہونا چاہئے وہ ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے۔ اور اس کے لئے انجمن جدوجہد کر رہی ہے۔

۱۹۵۹ء کی گرمیوں میں ایک دن این ایم خان چیف کمشنر کراچی نے مجھے یاد فرمایا۔ میں ان کے دفتر گیا تو انہوں نے کہا کہ سیٹو نے چند ایسے لوگوں کے نام پاکستان سے مانگے ہیں جو پاکستانی ثقافت سے سیٹو کے ممبر ملکوں کو روشناس کرا سکتے ہوں۔ میں چند نام کراچی سے بھیج رہا ہوں، ان میں آپ کا بھی نام شامل ہے۔ آپ مختصراً اپنے کام کا تعارف انگریزی میں لکھ کر مجھے جلدی بھیج دیجئے۔ سیٹو اور سنٹو کے نام تو سنے تھے مگر مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ یہ کہاں ہیں اور ان کا کام کیا ہے۔ خان صاحب سے میں نے زیادہ بات نہیں کی مبادا میری لاعلمی ان پر ظاہر ہو جائے۔ گھر آ کر اپنے "کارنامے" لکھ کر انہیں بھیج دیئے۔ کئی مہینے گزر گئے کسی قسم کی اطلاع نہ ملی۔ سوچا کہ اور بیسیوں تجویزوں کی طرح یہ تجویز بھی سرد خانہ میں ڈال دی گئی ہوگی۔ میں اسے بھول بھی گیا کہ اچانک مجھے سیٹو کے سکریٹری جنرل پوٹے سیراسوکا کا تار اور اس کے بعد چٹھی ملی کہ سیٹو نے تھائی لینڈ اور فلپینز میں پاکستان پر لیکچر دینے کے لئے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ آپ بتایئے کہ جلد از جلد کب روانہ ہو سکتے ہیں اور اپنے لیکچروں کی تفصیل لکھیئے۔ میں اس اطلاع سے ایسا بولایا کہ گھنٹوں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ سوچا کہ میاں جھکنڈن میں پڑ رہے ہو۔ انکار کر دو کہ میں نہیں آ سکتا۔ مگر جب اس کا ذکر چند مخلص احباب سے کیا تو انہوں نے تاکید کی کہ اس پیش کش کو فوراً قبول کر لو۔ فرسٹ کلاس کا کرایہ ملے گا اور ۲۵ ڈالر روزانہ۔ اچھا اس کو بھی چھوڑو۔ یہ دیکھو کہ یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ پورے پاکستان میں سے اس اہم ذمہ داری کے کام کے لئے تمہیں چھانٹا گیا ہے۔

میں نے سیٹو کی پیش کش کو قبول کرنے کی اطلاع سکریٹری جنرل کو دے دی۔ اور دس بارہ لیکچروں کے موضوعات بھی انہیں لکھ دیئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آگیا کہ سکریٹریٹ میں ڈاکٹر صمد شاہین ریسرچ آفیسر ہیں انہیں ایک مفصل خط لکھ کر دریافت کیا کہ معلوم کر کے لکھیں کہ یہ کیا معاملہ ہے اور اگر میں بنگ کاک آؤں تو کس ہوٹل میں ٹھہروں۔ دونوں خطوں کے جواب ایک ساتھ آئے۔ سیٹو کے دفتر نے لکھا کہ آپ کے موضوعات بہت پسند آئے۔ آپ کو اکیس دن تھائی لینڈ میں اور اکیس دن فلپینز میں رہنا ہوگا۔ تفصیلی پروگرام یہاں پہنچنے پر بنایا جائے گا۔ جلد از جلد آیئے۔ فروری سے اس علاقے میں گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنے سارے کام سمیٹنے تھے، سارے لیکچر لکھنے تھے۔ موسیقی کے ریکارڈ بنا کر ساتھ لے جانے تھے اور

کپڑے بھی بنوانے تھے۔ صمد شاہین صاحب نے لکھا تھا کہ آپ کے لئے سٹریانون ہوٹل میں کمرہ روک لیا گیا ہے۔ یہ ہوٹل ہمارے گھر کے بالکل قریب ہے۔ جلد آنے کی کوشش کیجئے۔

میں اپنے ساز و سامان سے لیس ہو کر وسط فروری میں روانہ ہو گیا۔ مجھے کے۔ ایل۔ ایم سے روانہ ہونا تھا اور اسی کی اطلاع میں نے سیٹو اور صمد صاحب کو دی تھی مگر ائیرپورٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ آج کے۔ ایل۔ ایم بارہ گھنٹے لیٹ ہے۔ ایک گھنٹہ بعد ائیر فرانس جانے والا تھا، میں اسی سے روانہ ہو گیا۔ صبح کے اندھیرے میں بنگ کاک پہنچا تو ایک کسٹم آفیسر نے بتایا کہ آپ کو لینے سیٹو کے دو افسر آئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ کے۔ ایل۔ ایم نہیں آرہا تو واپس چلے گئے۔ میرا سامان نہیں دیکھا گیا کیوں کہ مجھے و۔ا۔پ قرار دیا گیا تھا۔ کسی نے مجھے ائیر فرانس کی شہر جانے والی بس میں بٹھا دیا اور اس سریانون ہوٹل پہنچا دیا۔ بڑا ہوٹل تھا اور کمرے کا کرایہ ۲۵ روپے روزانہ تھا کھانے کے علاوہ۔ ناشتہ کے بعد میں سیٹو کے دفتر گیا۔ ڈاکٹر صمد شاہین کو اطلاع کرائی۔ وہ فوراً آکر گلے ملے "آپ کس طیارہ سے آئے؟ میں اور یہاں کا کلچرل آفیسر آپ کو لینے گئے تھے۔" میں نے انہیں تبدیلی کی وجہ بتائی۔ بہت سی باتیں ہوئیں، کافی پی۔ اسکے بعد وہ مجھے شعبہ ثقافت میں لے گئے۔ اور وہاں کے کارکنوں نے مجھے سکریٹری جنرل اور سفیر پاکستان سٹر برک سے ملایا جو اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ برک صاحب بولے "آپ کا انتخاب سیٹو کے آٹھ ممبر ملکوں کے سفیروں اور سکریٹری جنرل نے بہ اتفاق رائے کیا ہے۔"

"آپ کا شکریہ" میں نے کہا

بولے "جی نہیں۔ آپ پر کسی نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔"

روداد طویل ہے۔ مختصر یہ کہ تھائی لینڈ میں میں نے بارہ لکچر دیئے۔ ایک ڈھائی گھنٹے کا لکچر پاکستان کی موسیقی پر مع نمونوں کے دیا۔ بعض باتیں خود گا کر بھی بتائیں۔ اس لکچر میں دوسرے ملکوں کے سفیر بھی شریک ہوئے تھے اور دو سو کے قریب چیدہ چیدہ صاحبِ ذوق بلائے گئے تھے۔ ہندوستانی سفارت خانے کا اسٹاف بھی تھا۔ لکچر ختم ہونے پر سوال جواب بھی ہوئے۔ جلسہ برخواست ہونے پر سب سے پہلے برک صاحب نے آکر ہاتھ ملایا اور اتنی تعریف کی کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ بنگ کاک کے علاوہ مجھے بعض نزدیک اور چھوٹے شہروں میں بھی بھیجا گیا۔ صوبوں کے گورنروں نے استقبال کیا۔ تھائی لینڈ کے لوگ بالکل مشرقی مزاج کے ہیں۔ ان کی اپنی ایک تہذیب ہے۔ بدھ مت کے پیرو ہیں۔ لاکھوں بدھ کی مورتیاں ان کی عبادت گاہوں میں ہیں اور ان پر اتنا سونا چڑھا ہوا ہے کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ تھائی لینڈ میں سب اپنی ترقی یافتہ زبان تھائی بولتے ہیں۔ ذریعہ تعلیم بھی تھائی ہے۔ بہت کم لوگوں کو انگریزی آتی ہے۔ لکچر کے بعد اکثر مقامی لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ کیا آپ نے لندن یا آکسفورڈ میں پڑھا ہے؟ میں کہتا نہیں، اپنے ہی ملک میں پڑھا ہے اور ہمارے ملک میں ہر شخص کم از کم تین زبانیں جانتا ہے۔ ایک انفارمیشن آفیسر اور ایک کار میرے لئے ہر وقت موجود رہتی۔ مجھ سے سب خوش ہوئے اور میں سب سے خوش ہوا۔

صمد شاہین اور ان کی بیگم ممتاز شیریں نے مجھے یہ بھلا دیا کہ میں ایک اجنبی دیس میں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ رہیے ہوٹل میں تاکہ آپ کو زیادہ آرام ملے مگر کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیے۔ میں نے تکلف برتا تو انہوں نے بتایا کہ ہوٹلوں میں کھانا سور کی چربی میں پکتا ہے۔ لہٰذا شکریہ کے ساتھ میں ۲۱ دن تک انہی کے ساتھ کھاتا رہا۔ خالی وقت بھی انہی دونوں کے ساتھ گزرا۔ ان کا یہ احسان

احسان ایسا ہے کہ میں اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ رخصت کرنے بھی دونوں میاں بیوی ایئرپورٹ تک رات کے چار بجے آئے۔

منیلا پہنچا تو پاکستان کے سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری مسٹر حسین اور یونیسکو کے ایک افسر نے پذیرائی کی اور مجھے منیلا ہوٹل میں پہنچا دیا۔ شریا ٹون کی طرح یہ بھی ایک اوسط درجے کا ہوٹل تھا مگر کمرہ کوئی ۹۰ روپے روز کا تھا۔

شام کی چائے پر محکمہ تعلیمات کی ایک خاتون افسر ہمارے فرسٹ سکریٹری کے ساتھ آگئیں اور میرے لکچروں کا پروگرام مجھے بتاگئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مغرب کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کاؤنٹر والے نے اطلاع دی کہ سفیر پاکستان آپ سے ملنے آئے ہیں۔ رات کی دعوت کا بلاوا حسین صاحب ان کی طرف سے مجھے پہلے دے چکے تھے۔ میں کپڑے پہن کر نیچے اترا تو دیکھا کہ پیر علی محمد راشدی صاحب سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے ان سے مصافحہ کرنا چاہا تو انہوں نے گلے لگا لیا۔ ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی پیر حسام الدین راشدی بھی تھے۔ اصل میں میری ملاقات انہی سے تھی اور میں نے اپنی آمد کی اطلاع بھی انہی کو دی تھی۔ وہ بھی لپٹ گئے۔ دونوں کے ساتھ ان کی کوٹھی پر آیا۔ ہسپانوی وضع کی شاندار کوٹھی تھی۔ مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب ہم کھانے کے کمرے میں پہنچے تو راشدی صاحب کی بیگم بھی آگئیں۔ یہ مشرقی پاکستان کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ انگریزی بہت اچھی بولتی ہیں۔ ادب اور موسیقی کا خاص ذوق رکھتی ہیں۔ گلڈ کے کنونشن میں مشرقی پاکستان کے مشہور ادیبوں سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ بیگم راشدی نے ان میں سے کئی کو پوچھا۔ چند فنکاروں کا تذکرہ بھی چھڑا کہ اچانک بیگم راشدی نے پوچھا: "شاہد صاحب کہاں ٹھہرے ہیں۔؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولیں "یہیں کیوں نہیں آجاتے۔ یہ برابر والا کمرہ خالی ہے۔ آپ کھانے کے بعد جاکر انہیں یہیں لے آئیے۔ ہوٹلوں کا کھانا یہاں ٹھیک نہیں ہوتا۔" راشدی صاحب نے کہا: "ہاں یہیں آجائیں تو ٹھیک ہوگا۔" پھر انہوں نے بتایا کہ یہاں بھی سور کی چربی ہی چلتی ہے۔ بیگم نے کہا: "ان کے ہوٹل جانے کی ضرورت نہیں ہے، کار بھیج کر سامان منگوا لیجئے۔" میں نے کہا: "میرا سامان کمرے میں پھیلا ہوا ہے، صبح مجھے بلوا لیجئے۔" غرض اگلے دن میں راشدی صاحب کی کوٹھی میں آگیا۔ بیگم اور دونوں بھائیوں نے مجھے پھول پان کی طرح رکھا۔ یہاں کی یونیورسٹی اور میوزک یونیورسٹی میں میرے لکچر ہوئے اور چند چھوٹے شہروں میں بھی۔ ۲۲ دن عزت و آرام سے فلپینیز میں گزارے۔ اس ملک کی کوئی اپنی تہذیب مجھے دکھائی نہیں دی۔ امریکی تہذیب یہاں والوں نے اختیار کرلی ہے اور انگریزی بولتے ہیں۔ مذہباً عیسائی ہیں۔ اب انہیں اپنی مادری زبان "تغالو" کو ترقی دینے کا احساس ہوا ہے۔ ایک بہت دولت مند لوگوں کے ادارے نے مجھے لنچ دیا۔ اس کے صدر نے انگریزی میں کہا: "میں اپنی زبان تغالو میں تقریر کروں گا مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ معزز مہمان کس زبان میں بولیں گے۔" پھر خدا جانے انہوں نے اپنی مختصر تقریر میں کیا کہا۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ میں نے جوابی تقریر کرنے سے پہلے انگریزی میں کہا: "مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو اپنی زبان اتنی پیاری ہے کہ اس کے آگے آپ اپنے مہمان کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے۔ مجھے بھی اپنی زبان ساری دنیا کی زبانوں سے پیاری ہے۔ اس لیے میں اردو میں بولوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے پاکستان کے متعلق اردو میں پانچ سات منٹ کی تقریر کی۔ سب نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں اور کھانا شروع ہو گیا۔

میں ۲۲ دن فلپینیز میں رہا اس کے بعد اپنے خرچے سے جاپان چلا گیا۔ ۲۵ سال پہلے میں نے پروفیسر برلاس کی مدد سے ساقی کا "جاپان نمبر" شائع کیا تھا۔ پروفیسر برلاس میرے رشتے کے بھائی تھے اور ان کی بیگم بھی ننھیال کے رشتے سے میری بہن

ہوتی تھیں۔

پروفیسر برلاس ٹوکیو میں اردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ۱۸ سال جاپان میں اردو پڑھائی تھی۔ جاپان نمبر کے شائع کرنے کے بعد ہی سے مجھے جاپان دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ جاپان میں میں سولہ سترہ دن رہا۔ برلاس صاحب کے زمانے کا جاپان اب کہاں؟ جنگ کے بعد امریکی تسلط نے جاپان کی قدیم ثقافت کو بہت کچھ ختم کر دیا۔ ٹوکیو ایک کروڑ آبادی کا شہر ہے اور دنیا کے بڑے سے بڑے شہروں کا مقابلہ کرتا ہے۔

میں نے عید الفطر کی نماز ٹوکیو کی ترکی مسجد میں پڑھی۔ سو سوا سو مسلمان موجود تھے۔ پاکستانی سفارت خانے نے عید کی دعوت میں مجھے بھی بلایا تھا۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ میرے دوران قیام ہی میں ولی عہد کی شادی ہوئی۔ اور اتفاق سے اپریل کا پہلا اور دوسرا ہفتہ ہی موسم اور پھولوں کے لحاظ سے ایسا ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے سیاح جاپان آتے ہیں۔ چری بلاسم کی بہار اسی موسم میں دیکھی جاتی ہے۔ جاپان کے لوگوں کو دیکھ کر قائل ہونا پڑا کہ یہ قوم کبھی نہیں مر سکتی۔

جاپان سے واپسی میں میں چار دن ہانگ کانگ ٹھہرا۔ یہ فری پورٹ ہے اور یہاں دوسرے ملکوں کی درآمد کی ہوئی چیزیں تقریباً آدھی پونی قیمت پر مل جاتی ہیں۔ جاپان کے پاکستانی سفارت خانے میں دو ایک حضرات ایسے مل گئے تھے جو غائبانہ مجھے جانتے تھے۔ انہوں نے بڑی خاطر تواضع بھی کی تھی۔ ان سے میں نے ہانگ کانگ میں پاکستان ٹریڈ کمیشن کے ایک کارکن کے نام تعارفی چٹھی لے لی تھی۔ میں ہانگ کانگ میں اس دفتر کو تلاش کرتا چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی "کیا دیکھ رہے ہو؟"

اردو سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک بڑے میاں چلے آ رہے تھے۔ میں نے کہا "پاکستان ٹریڈ کمیشن کا دفتر دیکھ رہا ہوں۔"

بولے "وہ دیکھو، وہ اونچی سی بلڈنگ جو دکھائی دے رہی ہے۔ بس وہی ہے۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا "کیا آپ یہیں رہتے ہیں؟"

بولے "ہاں، کئی سال سے۔"

دفتر میں اختر صاحب سے ملا۔ بہت خوش ہوئے۔ بولے "پہلے کھانا کھاتے ہیں۔ آیئے۔" گھر سے ان کا کھانا آیا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک صاحب کو ٹیلی فون کیا اور زبردستی مجھے کھانے میں شریک کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم کافی پی رہے تھے کہ ایک صاحب آ گئے۔ اختر صاحب نے ان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ "یہ صاحب اپنے والد کے ساتھ کئی سال پہلے یہاں آ کر بس گئے تھے۔ ان کا کام ہی یہ ہے کہ آنے جانے والوں کو ان کی پسند کا سامان دلواتے ہیں۔ چلیئے ان کے ساتھ چل کر آپ کا سامان بازار میں دیکھ لیتے ہیں۔" دو دن ہم نے کئی دکانوں میں سامان دیکھا۔ تیسرے دن اُن صاحب نے رات کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ دن کو میرا سارا سامان مجھے خرید دیا۔ رات کو اختر صاحب کے ساتھ اُن کے گھر گیا۔ انہوں نے اپنے والد سے ملوایا۔ کبھی ہندوستان میں سرکاری ملازم تھے۔ پھر یہاں آ کر بس گئے۔ اور یہیں شادی بھی کر لی۔ کمیشن ایجنٹ کا کام شروع کیا۔ اللہ نے برکت دی۔ لڑکے نے کام کو فروغ دیا اور سارا کام خود سنبھال لیا۔ کھانے کے بعد وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ اس میں میرا سارا سامان آیا رکھا ہوا تھا۔ بولے "یہ سامان ایک مہینے کے اندر آپ کو کراچی میں مل جائے گا۔"

چار بجے رات کو دھواں دھار بارش میں یہ صاحب میرے ہوٹل میں آئے اور مجھے ہوائی جہاز پر سوار کرکے رخصت ہوئے۔ مجھے گھر سے نکلے دو مہینے ہو گئے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ پر لگ جائیں اور اڑکر پہنچوں۔ مگر سخت بارش اور کہر تھی اس لیے جہاز چار گھنٹے لیٹ روانہ ہوا۔ میں فرسٹ کلاس پسنجر تھا۔ حسبِ معمول اعلیٰ درجے کی شرابیں پیش کی گئیں۔ میں نے کہا: "میں مسلمان ہوں، شراب نہیں پیتا اور نہ سور کا گوشت کھاتا ہوں۔"

ایئر ہوسٹس نے حیرانی سے دیکھا۔ بولی "تو آپ کے لیے کافی لاتی ہوں۔"

پھر مجھے سگریٹ پیتے دیکھا تو کریون اے کی بہت ساری ڈبیاں دے گئی۔ کھانے کے وقت آکر کہا "نو پورک؟"

میں نے کہا "نو"

بولی "بیف اینڈ مٹن؟"

میں نے کہا "یس"

غرض یہ کہ اس نے چھوٹی موٹی چیزوں کی بھرمار کردی۔ دوپہر کو ہنگ کانگ پر جہاز ٹھہرا، صمد شاہین اور ممتاز شیریں کی پرتپاک مہمان نوازی یاد آگئی۔ شام کو کلکتہ اترا اور رات کے ایک بجے کراچی۔ میں ہی ایک اترنے والا مسافر تھا۔ کسٹم والے بڑی شرافت سے پیش آئے۔ میرے ساتھ بہت سامان تھا مگر انہوں نے دیکھ بھال کر چھوڑ دیا کیونکہ کوئی چیز خلافِ قاعدہ نہیں تھی اور پاکستانی اجازت نامہ کے مطابق سامان تھا۔ باہر نکلا بیوی بچے اور عزیزوں اور دوستوں کا ہجوم تھا۔ چھ کاروں میں سب بھر کر آئے۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ بامراد و شادکام اپنے گھر واپس پہنچ گیا۔ مجھے اس کی خوشی زیادہ تھی کہ میں نے اپنے ملک کی ایک اہم خدمت انجام دی۔ مشرق کے ملکوں میں پاکستان کو لوگ جانتے ہی نہیں۔ میری شیروانی اور ٹوپی کو دیکھ کر لوگ پوچھتے تھے "ARE YOU FROM INDIA?"

اور میں کہتا تھا۔ "NO, FROM PKISTAN" تو وہ سوچ میں پڑ جاتے کہ یہ کونسا ملک ہے؟

پاکستان واپس آنے کے بعد پھر وہی روزانہ کنواں کھودنا اور پانی پینا۔ ایک مہینے بعد ڈھاکہ میں "یوم امیر خسرو" منایا گیا۔ مجھے بہ اصرار بلایا گیا۔ شاعروں کو تو فیس بھی مل جاتی ہے، صدر کو کوڑی بھی کوئی نہیں دیتا۔ مگر اردو، موسیقی اور خسرو کا معاملہ تھا اس لیے ڈھاکہ گیا۔

امیر خسرو کی موسیقانہ اختراعات پر خطبۂ صدارت دیا اور ان کے وضع کردہ موسیقی کے اسلوبوں کو عملاً پیش کیا۔ کئی متعلق محفلیں ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو میں بھی ایک اجتماع ہوا اور کچھ بولنا پڑا۔ اردو کے سرگرم کارکنوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے پرانے استاد ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کھانے پر بھی بلایا اور پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ شرکت و صدارت کے سلسلے میں حیدرآباد سکھر، خیرپور، نواب شاہ، ملتان، لاہور، پنڈی کے چکر کاٹے اور ادبی ہنگامے رہے۔

۱۴ اگست ۱۹۶۳ء کو اخباروں میں اعلان ہوا کہ اس سال عطیۂ صدر "افتخارِ ادب" مجھے دیا گیا اور اس اعزاز کے ساتھ پانچ ہزار روپے بھی ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اتنا بڑا اعزاز بھی ملا اور بروقت مالی امداد بھی ہوئی۔ مجھے بچی کی شادی کر کے ۲۰ ستمبر کو اسے کینیڈا روانہ کرنا تھا اور یہاں روپے پیسے کے باب میں خیریت ہی تھی۔ سخت پریشان ہو کر اپنے ہم زلف کی ضمانت پر

خیبل بنک جاکر ممتاز حسن صاحب کی سفارش سے ایک ہی دن میں قرض حاصل کیا تھا جسے ادا کرنے کی بظاہر کوئی سبیل نہیں تھی کہ غیب سے انعام کا انتظام ہوا۔ جو اخراجات پہلے ہو چکے تھے اُن کے علاوہ فی الوقت اتنی ہی رقم خرچ ہوئی تھی۔ چھ سو شریک ہونے والوں کی مہمانداری کی گئی تھی۔ بھرم بندھا رہا اور اللہ نے عزت رکھ لی۔ رقم ملتے ہی بنک کا قرضہ ادا کردیا اور پھر ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گیا۔ میرا بھروسا تو خدا پر ہے۔ وہی ساری مشکلیں حل کردیتا ہے۔

میری عمر اس وقت ۷۵½ سال کی ہے۔ بہت گئی تھوڑی رہی، اللہ باقی بھی ساتھ خیر کے گزار دے۔ سر چھپانے کو جگہ موجود ہے۔ کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا مل جاتا ہے۔ اُجلے پوشی سے گزر ہو جاتی ہے۔ مادّی دولت نہیں ہے تو کیا غم؟ سکونِ قلب کی دولت سے تو مالا مال ہوں۔ بس یہ آرزو ہے کہ میرے سب بچے اپنے اپنے ٹھکانے سے ہو جائیں اور میں حج بیت اللہ سے مشرف ہو جاؤں۔ بس پھر میں اطمینان سے مر سکوں گا۔

SOLE DISTRIBUTORS

SAKAR PUBLISHERS PVT., LTD.
107-JOLLY BHAVAN NO. 1,
10 NEW MARINE LINES,
BOMBAY-400 020.

آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضا
مدیر
صابر دت